01

ڈرامے کی ابتدا

انسان جب غاروں اور گپھاؤں میں زندگی بسر کرتا تھا، جسم پر کھالیں یا چھالیں لپیٹتا تھا، تہذیب و تمدن کا نام و نشان نہ تھا اس وقت بھی اس کا وجود جذبہ و احساس کی لہروں پر بہنے کے لئے مچل جاتا رہا ہوگا۔ اس وقت بھی اس کے اندر خود گری، خود نگری اور خود شکنی موجود رہی ہوگی، اس لئے بھی کہ ہمارے فکر و ذہن کی دسترس میں جو انسانی تاریخ ہے، اس کا ہر دور اس خصوصیت سے مملو ہے۔ یہی خود آشکاری تخلیق فن کا محرک بنی۔ دنیا کا پہلا فن کار کون تھا؟ نہیں کہا جا سکتا لیکن یہ بات تو ہے کہ اس نامعلوم پہلے فنکار کے پیش نظر بھی وہی بات رہی ہوگی، جو آخری فنکار کے پیش نظر ہوگی۔ یعنی اظہار ذات۔ جب کوئی پہلی بار نغمہ ریز ہوا، جب کسی نے پہلی مرتبہ دلفریب دھن باندھی، گیت کے دو بول کہے اور جسمانی اعضا کو ایسے نظم و ضبط سے حرکت دی کہ نمونۂ فن جلوہ گر ہوا تو اسے بھی یہ خبر نہ رہی ہوگی کہ اس کا قیمتی سرمایہ منزل بہ منزل، عہد بہ عہد، سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا اور ترمیم و اضافہ کے مختلف مراحل سے گذرتا ہوا ایک ارتقائی ڈگر پر چل نکلے گا۔ نظریات آتے رہے، مٹتے رہے، ہزاروں مذاہب آئے اور گئے، کتنی نسلیں وقت کے پُرسکون آغوش میں سو گئیں لیکن یہ اظہار ذات کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا، جاری ہے اور جاری رہے گا، پیچ در پیچ اضافی شکلوں کے ساتھ۔ ارتقائی منزلوں نے بول، تان اور جسمانی حرکت کو شاعری، موسیقی اور

رقص بنا دیا اور اب ان سے مستقل طور پر تجریدی صورت گری کی جانے لگی۔

جذبہ کے ذریعہ جذبوں کو چھیڑنا، اضطراب و شوق ظاہر کرنا، اپنی انفرادیت کی نمائش کرنا، حیات و کائنات کا تجربہ و مشاہدہ کر کے نت نئی قماش، نئے دائرے، نئے خطوط اور نئی صورتیں تراشنا، ظلمت و نور اور اثبات و نفی کی متضاد لہروں کے تصادم سے اکائیاں بروئے کار لانا، خود معلوم و محسوس کرنا اور دوسروں کے علم و اطلاع اور ذوق و شوق کے لئے اضافے کا باعث بننا، فطری امر ہے، ایک جبلّی عمل۔ اور فن کی ایجاد و تخلیق کا انحصار اسی پر ہے۔ دراصل کائنات دو ہیں۔ ایک اندرونی کائنات یعنی انسان کی ذات۔ دوسری خارجی کائنات۔ اندرونی کائنات میں ذکاوت، ذہانت، نیّت، خواہش، آرزو، تمنّا، جذبہ، احساس، تصوّر، تفکّر، تدبر، تعقّل، تخیّل وغیرہ اور اس کے بے شمار متعلقات ہیں۔ خارجی کائنات میں یہ ہماری دنیا اور اس کی تمام رحمتیں، نعمتیں، مادّہ اور اس کی چھوٹی بڑی لاکھوں شکلیں اور ارض و ملک کے تمام موجودات شامل ہیں۔ ان دونوں کائناتوں میں قریبی رشتہ ہے۔ خارجی کائنات جب انسان کی ذاتی کائنات میں داخل ہو کر ملتی، گھلتی ہے تو پھر شعوری اور غیر شعوری طور پر تحریک تخلیق ہوتی ہے۔ ایک زبردست کشمکش کے بعد تعمیری و تخلیقی عمل کا اجرا ہوتا ہے اور پھر جذبہ جس کی حیثیت اساسی ہے، ایک اہم قوت بن کر اس عمل تخلیق میں شریک ہوتا ہے تاکہ فنکار کو بھی سکون و آسودگی ہو اور دوسرے بھی اس سے متاثر ہو سکیں۔

انسان کی ایک مجبوری ہے۔ اسے جو کچھ معلوم ہے، جو کچھ یہ محسوس کرتا ہے، اسے سینہ میں دبائے نہیں رکھ سکتا۔ فکر و عمل دونوں اعتبار سے وہ جو کچھ سوچتا ہے اور سیکھتا ہے اسے دوسروں تک پہنچانے کی سعی کرتا ہے۔ نقالی کی جبلّت (Mimesis Instinct) اس ترسیل و اخراج کا وسیلہ بنتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جہاں کہیں آدمی پیدا ہوا، وہیں پر اس نے خارجی دنیا کے حالات و آثار سے ذہنی مفاہمت کی اور اپنے معلومات و محسوسات کو

اپنی جمالیاتی صلاحیتوں کی بدولت دوسروں تک اُس نے منتقل کیا، اپنی انفرادیت و انانیت کا اظہار کیا، اپنی تسکین اور دوسروں کے سکون کے واسطے، اپنی مسرت اور دوسروں کی نشاط کی فراہمی کے واسطے اور اس طرح اس نے ڈرامے کی داغ بیل ڈالی۔ جو گیت کہے، جو نغمے گنگنائے، جو رقص پیش کیا، جو مکالمے ادا کئے، ان کے باضابطہ امتزاج سے ڈراما کا سانچا مکمل ہوا اور ان ہی عنصروں سے مل کر تھیٹر کی تعمیر ہوئی۔ اس وقت احساس و علم کو دبائے رکھنا اور مشکل ہے کہ جب آدمی فنکار بھی ہو یعنی اس کے پاس انتقالِ جذبات و افکار کے وسیلے بھی ہوں۔ فنکار ان حسی تجربوں کو باہر نکالے بغیر نہیں رہ سکتا جو اس کے وجود کے اندر بھاپ کی طرح کھلبلی مچاتے ہیں۔ اس طرح صرف فنکار ہی کے جذبات مطمئن نہیں ہوتے تماشائی بھی سکون پاتے ہیں۔ ارسطو نے اسی جذباتی نکاسی کو catharsis کہا ہے۔ تطہیر نفس کا یہ عمل بہت ہی ناگزیر طور پر ڈرامے سے وابستہ ہے۔

ڈراما کی کامیابی نقالی اور کامیاب نقالی پر منحصر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ نقل سے جسے تقلید اور پیروی بھی کہتے ہیں، انسانی زندگی کا کوئی گوشہ خالی نہیں۔ نقالی ہی زندگی ہے۔ انسان کی انفرادی زندگی کے خوشگوار ارتقا کے لئے اچھی نقالی ضروری ہے۔ اسی طرح انسان کی اجتماعی زندگی ہزاروں ہزار برس تک نقالیوں کی متعدد و مختلف منزلوں کو طے کرتی ہوئی موجودہ ایٹمی دور میں داخل ہوئی۔ ہاں! زندگی کو فن کے روپ میں ڈھالنے والی نقالی سب کے بس کی بات نہیں یعنی نقل تو عمومی مزاج ہے۔ البتہ فنکارانہ نقالی مشکل۔ فنکار آواز، رنگ اور حرکت کے اپنی ذات میں محفوظ معلوماتی اور جذباتی پوشیدگی کو عریاں کر دیتا ہے۔ شمیم صبح کی عطر بیز ہوائیں ہوں یا وادیٔ کشمیر کے زعفران زاروں میں لہلہاتے ہوئے پودے،

کنوارے حُسن کی حشر سامانیاں ہوں یا غزالانِ ختن کی خوش خرامیاں، نیلے جھیلوں کی پُرسکون سطح کی دلکش لہریں ہوں یا سیلابی دریا کا پُرشور تموج، بادلوں کی چھوٹی چھوٹی کی آوارہ گردی ہو یا روشن تاروں کا ساکت کارواں، مہتاب اور ملگجی شب کی خموش گفتگو ہو یا شاہراہوں پر پھسلتے ہوئے افراد کا ہجوم، کائنات کے تمام جلوے اور زندگی کے تمام مشغلے فنکار یا نقال کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ فنکار اپنی بلند ترین صلاحیتوں اور عظیم ترین کاوشوں کے ذریعہ انہیں نئی زندگی دیکر سامنے لاتا ہے۔ نقالی کی اس اہمیت سے کسی صورت میں انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اسی بنیاد پر افلاطون نے فن کو نقالی کہا۔ آدمی ہے بھی تو عکاس و نقال۔ ارسطو نے اس کی تائید و وضاحت کرتے ہوئے بوطیقا میں لکھا ہے :

"شاعری (یعنی ڈرامے) کی عمومی ابتدا کے دو سبب ہیں اور ہر دو سبب انسانی جبلّت کا خاصہ ہیں۔ بچپن ہی سے نقالی آدمی کی فطرت میں داخل ہے۔ اسے کمتر حیوانات پر بہ ایں وجہ فوقیت حاصل ہے کہ وہ دنیا کا سب سے بڑا نقال ہے اور اولاً نقالی ہی کی مدد سے آگاہی پاتا ہے پھر یہ بھی ایک قدرتی امر ہے جو سب پر صادق آتا ہے کہ لوگ نقالی کے کارناموں سے لذّت یاب ہوتے ہیں۔ اس دوسرے نکتے کی صداقت تجربے سے ثابت ہے۔ آبجکٹ دیکھنے میں خواہ المناک ہی ہوں ہم فن کے دائرے میں ان کی حقیقی پیش کش سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس کی صراحت ایک دوسری حقیقت سے ملتی ہے۔ حصولِ علم نہ صرف فلسفی بلکہ باقی بنی نوع آدم کا بھی سب سے بڑا مسرت انگیز مشغلہ ہے، اس کی صلاحیت کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو۔ تصویر دیکھ کر اس لئے

مسرت ہوتی ہے کہ آدمی بیک وقت سیکھتا اور اشیاء کے معنی جانتا ہے"۔

یعنی نقل اُتارنا اور پھر اس سے مسرور ہونا دونوں فطری فعل ہیں اور ڈرامے کی پیدائش میں یہ محرکانہ حیثیت رکھتے ہیں۔

نقالی، جس سے ڈراما اور دوسرے فنون پیدا ہوئے، انسان کو فطری طور پر ودیعت کی گئی۔ گویا انسان روزِ ازل ہی سے اس کے جراثیم اپنے ساتھ لایا۔ چنانچہ وحشیانہ قبائلی زندگی ڈرامائی اثرات سے بھری پڑی ہے۔ محققین اور مورخین نے صدیوں پُرانے دستاویزی ذخیروں کو کھود کر بہ کثرت ایسی مثالیں پیش کی ہیں جن میں ڈرامائی نقالی صاف طور پر سامنے آئی ہے۔ انسان اپنے خداؤں کو خوش کرنے اور مسرّت کے لمحات کو گذارنے کے لئے بالعموم ناچ، شاعری اور موسیقی سے دل بہلاتا رہا۔ ڈھول اور نقاروں کا شور و غل ان کے آہنگ و توازن میں تعاون کرتا رہا۔ نغمۂ جنگ یا رقصِ جنگ ہو یا نغمۂ فتح یا رقصِ فتح، یہ بہت پہلے اس وقت بھی تھے جب آدمی اندھیرے غار اور گھنیرے جنگل میں رہتا تھا اور اب بھی ہیں۔ جو فرق ہے وہ محض ضمنی اور ذیلی۔ ڈرامے کو ایک مکمل فنی اکائی بننے کے لئے رقص، موسیقی اور شاعری کے متعدد مرحلوں کو ایک طویل عرصے میں طے کرنا پڑا۔

ابتک کے تحقیقی حوالوں سے اندازہ کیا جاتا ہے کہ مغرب میں ڈرامے کی ابتدا کا سہرا یونان کے سر ہے۔ یونان اس زمانے میں بھی علم و فضل، تہذیب و تمدن، ادب و دانش اور فلسفہ و منطق کا گہوارہ بنا ہوا تھا جب ساری دنیا جہالت کی گود میں سوئی ہوئی تھی۔ اس عالمِ کم مائیگی کے دور میں بھی یونان میں اخلاق، سیاست اور ادب و تہذیب کی درس و تدریس جاری تھی۔ ڈراما نگاری یونان قدیم میں ہوتی رہی۔ افلاطون و ارسطو کے عہد تک تو یہ صنف وہاں اپنی عروجی منزل کو بھی پہنچ چکی تھی۔ ڈرامے پر جس